مقدّمہ

پروفیسر خورشید احمد
چیئرمین انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد، ترکستان (وسطِ ایشیا) اور شمالی قفقاز کے علاقوں پر ایک اور تحقیقی مطالعہ قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہے۔ کتاب کے مصنف رفیقِ محترم آباد شاہ پوری ہیں، جن کی ایک کتاب "ترکستان میں مسلم مزاحمت" اس سے پہلے انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے پیش کی جا چکی ہے۔ اس کتاب میں ان تاریخی، سیاسی، اخلاقی اور معاشرتی اسباب و عوامل کا تجزیہ کیا گیا تھا جن کے نتیجے میں زیرِ بحث علاقوں کی مُسلم اُمّہ روسیوں کی زنجیرِ غلامی میں جکڑی گئی اور ان زنجیروں کو بار بار کاٹنے کی کوشش میں ناکام رہی۔ زیرِ نظر کتاب میں ان مسلمانوں کے ماضی کے پس منظر، موجودہ احوال اور مستقبل پر بحث کی گئی ہے۔ اس طرح ان علاقوں کے مسلمانوں کی پوری تاریخ اور اس کا تجزیاتی و تحقیقی جائزہ ان دونوں کتابوں میں سمٹ آیا ہے۔

انگریزی اور دوسری یورپی زبانوں میں اس موضوع پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، لیکن کسی غیر یورپی زبان میں یہ پہلی کتابیں ہیں جو علمی اور تحقیقی انداز میں لکھی گئی ہیں، اور جو بے اعتنائی اور بے خبری عالمِ اسلام میں اس خطّے کے متعلق پائی جاتی ہے، اس کو پاکستان اور اردو زبان بولنے اور سمجھنے والے علاقوں کی حد تک دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

افغانستان کے جہادِ حریت اور عالمِ اسلام میں اسلامی نظامِ زندگی کے احیاء کی جو لہریں اٹھ رہی ہیں، ان کا ارتعاش زیرِ مطالعہ علاقوں کے اندر تک پہنچ رہا ہے اور اس کے نتیجے میں وہاں جو سیاسی بیداری اور تہذیبی و ثقافتی شعور پیدا ہو رہا ہے، اس نے پوری دنیا کے علمی حلقوں کی توجہ اپنے اوپر مرتکز کر دی ہے؛

چنانچہ اس ضمن میں جو خبریں آئے دن آتی رہتی ہیں وہ ذہنوں میں متعدد سوال پیدا کر رہی ہیں۔ کیا روس کے زیرِ نگیں مسلمانوں میں اسلامی احیاء کی تحریک ہے؟ اگر ہے تو اس کی نوعیت کیا ہے؟ کیا اس کا تعلق سیاسی یا قومی بیداری سے ہے؟ سیاسی و قومی بیداری اسلامی احیاء کی تحریک کا نتیجہ ہے یا تہذیبی و ثقافتی بیداری کا؟ مسلمانوں کی معاشرتی، اقتصادی و تہذیبی کیفیت اور ثقافتی شب و روز کیسے ہیں؟ اس سلسلے میں ان روسی دعوؤں کی کیا حقیقت ہے کہ مسلم اُمّہ کی جگہ سوویٹ قوم لے چکی ہے؟ نئی نسل کے رجحانات کیا ہیں، وہ کس انداز میں سوچتی ہے، روسیوں کے ساتھ زندگی کی مختلف سطحوں پر ان کے تعلقات کی کیفیت کیا ہے، وہ اپنے مستقبل کو کن خطوط پر اٹھانا چاہتے ہیں، خود روسیوں کا ان رجحانات کے بارے میں کیا رویّہ ہے؟ مسلمانوں کی آبادی میں زبردست اضافہ کی خبریں کس حد تک درست ہیں اور اس کے مسلمانوں اور روسیوں کی زندگی اور باہمی تعلقات پر کس قسم کے اثرات پڑیں گے۔ اس بڑھتی ہوئی آبادی کے بارے میں روسیوں کا ردِّ عمل کیا ہے اور وہ کیا انسدادی تدبیریں سوچ رہے ہیں، نیز اس دینی، سیاسی اور تہذیبی بیداری کی روشنی میں ان علاقوں کا مستقبل کیا ہے، کیا ان کی آزادی کے امکانات روشن ہیں اور کیا افغانستان میں اسلامی قوتوں کا جہاد ان کے مقدر کو بدلنے میں اپنا کردار ادا کرے گا؟

یہ اور اسی قسم کے اور بیسیوں سوالات ہیں جو پیدا ہو رہے ہیں اور روز بروز نازک اور سنجیدہ ہوتے جا رہے ہیں۔ آباد شاہ پوری صاحب نے اپنی کتاب میں انہی سوالات پر بحث کی ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے روسیوں کے ماضی کے رویّوں کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ موجودہ کیفیات کا گہرا تنقیدی مطالعہ کیا ہے۔ پوری کتاب آٹھ ابواب پر مشتمل ہے جن میں سے پہلے تین ابواب زاروں کے عہد سے ۱۹۷۰ء کے عشرے تک کی روسی پالیسیوں اور ان کے نتائج و اثرات سے بحث کرتے ہیں جو انہوں نے "مسلم مسئلے" کو حل کرنے کے لیے (جو روسی زار ورثے میں چھوڑ گئے تھے) اختیار کیں۔ ان ابواب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ "مسلم مسئلے" کا حل تلاش کرنے کی حد تک مسیحی زاروں اور سوویٹ زاروں کا نہ اندازِ فکر مختلف تھا اور نہ ان کے اقدامات اور تدبیروں میں بنیادی طور پر کوئی فرق تھا۔ فرق اگر تھا تو یہ کہ زاروں کے حربے قدیم انداز کے تھے۔ اس کے برعکس سوویٹ حکمرانوں کے ہتھیار جدید ترین اور فسطائی طرز کے تھے اور اسی

فرق کا یہ نتیجہ تھا کہ جہاں زار اپنے اقدامات میں ناکام رہے وہاں سوویٹ حکمرانوں کی پالیسیاں اتنی مؤثر ثابت ہوئیں کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ سوویٹ اخبارات اور رسائل خبریں دے رہے تھے کہ مذہب پر موت طاری ہو چکی ہے اور قومی ثقافتیں ایک دوسرے کے اندر ضم ہوتی جا رہی ہیں۔ یہاں تک کہ ۱۹۷۱ء کے اوائل میں خود برژنیف نے اعلان کیا کہ "سوویٹ عوام کی ایک نئی تاریخی کمیونٹی ہمارے ملک میں وجود میں آ چکی ہے۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ جنگ سے پہلے تک سوویٹ اقدامات کا دباؤ اتنا شدید تھا کہ مسلمانوں کی اکثریت اس دباؤ سے کچلی گئی۔ رسم الخط کی تبدیلی نے اسے اپنے ماضی سے کاٹ دیا۔ چند ایک کے سوا تمام مسجدیں منہدم کر دی گئیں۔ مذہبی تعلیم پر گھروں کے اندر بھی پابندی لگا دی گئی اور اسے جرم قرار دے دیا گیا جس کے نتیجے میں مذہبی زندگی ختم ہو کر رہ گئی۔ اس طرح عالمی جنگ سے پہلے تک جو نسل پروان چڑھی اس کی اکثریت کا مذہب اور قومی تہذیب و ثقافت سے کوئی تعلق نہ تھا، تاہم دوسری جنگ کے دوران روسی حکمرانوں نے اپنی گرفت ڈھیلی کی تو مذہب کی وہ چنگاری جو راکھ میں دب چکی تھی اور بظاہر یہی نظر آتا تھا کہ وہ دم توڑ چکی ہے، پھر سے دلوں میں دمکنے لگی۔

خروشچیف نے اس چنگاری کو پھر بجھانا چاہا، مگر ایک بار جب کسی عمل کا ردِ عمل شروع ہوتا ہے تو پھر اسے روکنا بہت مشکل ہوتا ہے؛ چنانچہ عین اس زمانے میں جبکہ سوویٹ ذرائع ابلاغ مذہب کے خاتمے اور سوویٹ قوم کے جنم لینے کا مژدہ دنیا کو سنا رہے تھے ایک تیسری نسل مذہب کی اس دمکتی ہوئی چنگاری کو دل میں لیے میدانِ عمل میں تھی۔ اور چوتھی نسل اس نسل کے زیرِ سایہ ہوش کی آنکھیں کھول رہی تھی۔

یہ وہ حقیقت تھی جس سے روسی حکومت اور کمیونسٹ پارٹی کے عہدیدار ایک مدت تک آنکھیں چراتے رہے اور مذہب کے خاتمے اور سوویٹ قوم کے وجود میں آنے کا راگ الاپتے رہے۔ بظاہر دکھائی دینے والے حالات اس راگ کے ہم آہنگ تھے، مگر بالآخر کمیونسٹ رہنماؤں کو تسلیم کرنا پڑا کہ ہمارے ذرائع اب تک جو خبریں دے رہے تھے تازہ ترین معلومات ان کی نفی کرتی ہیں۔ مذہب نہ صرف زندہ ہے بلکہ نئی نسل

میں تیزی سے پھیل رہا ہے۔ زیرِ زمین تحریکیں جاری ہیں جنہیں مسلم بورژوؤں کے بعض علماء بھی (جنہیں مسلمان "سرکاری علماء" کہتے ہیں) تقویت پہنچا رہے ہیں۔ مذہبی بیداری اور احیاء کے ساتھ معاشرتی، اقتصادی، سیاسی اور تہذیب و ثقافت کے شعبوں میں بھی بیداری اور شعور پیدا ہوا۔ مسائل کے بارے میں نئی نسل کے سوچ کے زاویے اور روسی حکمرانوں کے متعلق رویے تبدیل ہوئے۔ اس طرح پوری اجتماعی زندگی میں بیداری کی لہریں پیدا ہوگئیں۔ اس فضا کو مسلمانوں کی بڑھتی اور روسیوں کی گھٹتی ہوئی آبادی اور اس سے پیدا ہونے والے طوفانی مسائل نے مزید گھمبیر بنا دیا ہے جس کے نتیجے میں مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں بحث مباحثہ عام ہو چلا ہے۔

محترم آباد شاہ پوری نے ان تمام موضوعات اور مسائل پر تحقیق کی ہے۔ مصنف گزشتہ بیس بائیس برس سے ماوراالنہر کے مسلمانوں اور عالمِ اسلام میں روسیوں کی نظر باقی اور سیاسی حکمتِ عملی پر لکھ رہے ہیں۔ وہ زیرِ مطالعہ علاقوں کے مسلمانوں کی تاریخ اور ان کے مسائل پر بہت گہری نظر رکھتے ہیں، اور پیش آمدہ مسائل پر چھچلتی یا اچٹتی ہوئی نظر ڈال کر نہیں رہ جاتے بلکہ ان کے اندر اترنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان مسائل کے پیچھے کارفرما اسباب و عوامل کا ایک مؤرخ کی طرح کھوج لگاتے ہیں اور صاحبِ فکر تجزیہ نگار کی طرح تجزیہ کرتے اور نتائج کا استنباط کرتے ہیں۔ ان کی یہ خصوصیت پوری کتاب میں پائی جاتی ہے۔ اس میں ماوراء النہر اور قفقاز کے مسلمانوں کی زندگی کا ایک ایک گوشہ اپنے حقائق کے ساتھ سامنے آ گیا ہے اور اس کے آئینے میں ان بلند بانگ دعوؤں کا حقیقی چہرہ بھی دیکھا جا سکتا ہے، جو روسی حکمران مسلمانوں کی آزادی، خوشحالی، اقتصادی و معاشرتی ترقی اور دستوری حقوق و مراعات کے بارے میں کرتے رہتے ہیں۔ مصنف نے ان تمام پہلوؤں پر جامع، مبسوط اور مدلل گفتگو کی ہے۔

کتاب کا آخری باب اس لحاظ سے اہم ہے کہ یہ مسلمانوں کے مستقبل سے بحث کرتا ہے۔ مغربی مصنفین کے نزدیک مسلمان علاقوں کے حالات "ٹائم بم" کی حیثیت رکھتے ہیں جبکہ روسی سرے سے اس نقطۂ نظر کو مسترد کرتے ہیں۔ مصنف نے فریقین کے موقف کا تجزیہ کیا ہے اور گزشتہ مباحث کی روشنی میں اس امر پر بحث کی ہے کہ مسلمانوں کے اندر جدّوجہد کا جو جذبہ پیدا ہو چلا ہے اس کی کامیابی

کے کس حد تک امکانات ہیں۔ مستقبل میں ہونے والی جدّوجہد کی قیادت کہاں سے اٹھے گی اور اس جدّوجہد کو کامیاب کرنے کے لیے اس قیادت کے اندر کیا خصوصیات ہونی ضروری ہیں۔ نیز اس جدّوجہد کو کس قسم کے عوامل کامیابی سے ہمکنار کر سکتے ہیں۔ مسلمانوں کے اندر پیدا ہونے والی بیداری سے عہدہ برآ ہونے کے خود روسیوں کے سامنے کون سے متبادل راستے ہیں اور روسیوں سے کس راستے کو اختیار کرنے کی توقع کی جا سکتی ہے۔

آخر میں مصنف نے اس نازک صورتِ حال کا جائزہ لیا ہے جو ایک بیرونی عنصر جہاد افغانستان کے درآنے سے پیدا ہو گئی ہے۔ مصنف کا مطالعہ یہ ہے کہ روس کے محکوم مسلمانوں کے مستقبل کے امکانات چاہے کتنے ہی روشن ہیں اس کا آخری اور دور رس اثرات کا حامل فیصلہ افغانستان کا جہادِ آزادی کرے گا۔ افغان مجاہدین اس جہاد میں روس کو ہزیمت سے دوچار کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں یا ناکام، دونوں صورتوں میں مسلمانوں کی قسمت پر دور رس اثرات پڑیں گے۔ ان مسلمانوں کی قسمت پر ہی نہیں افغانستان اور سوویٹ روس کے پڑوسی مسلمان ملکوں اور ان سے متصل شرقِ اوسط کے تیل کے علاقوں کی قسمت پر بھی پڑیں گے اور یہ وہ بحث ہے جو عالمِ اسلام کی مسلم اُمّہ اور اس کے حکمرانوں کو سوچنے اور فیصلہ کن کردار ادا کرنے کی دعوت دیتی ہے۔

میں اس توقع کے ساتھ اس کتاب کو خوش آمدید کہتا ہوں کہ مسلم اُمّہ کے حکمران، سیاستدان، علمائے کرام، دانشور، ادیب، صحافی اور فوجی ماہرین اس کتاب میں اٹھنے والی دعوتِ فکر کی طرف خصوصی توجہ دیں گے۔

اسلام آباد
۱۵ مارچ ۱۹۸۷ء

خورشید احمد